۲۲ دسمبر ۱۹۷۰ء

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۲۹ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۴۸

اس شمارے میں

اداریہ

کچھ بنیادی باتیں

دستور کی دفعہ ۳۵۰ الف میں کہا گیا ہے کہ ہر ریاست کی یہ کوشش ہوگی کہ وہ ابتدائی تعلیم لسانی اقلیتوں کو ان کی مادری زبان میں دے اور مادری زبان کا فیصلہ طالب علم کے والدین یا سرپرست کریں گے۔ لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ مادری زبان میں ابتدائی تعلیم دینے کے معاملے میں سب سے زیادہ بے پروائی اور بے نیازی اتر پردیش کی حکومت کی طرف سے برتی گئی ہے، اگرچہ بعض دوسری ریاستی حکومتیں بھی مہاراشٹر اور جنوبی ہند کی ریاستوں کو چھوڑ کر، اس الزام سے بری نہیں ہیں۔ جب کبھی ان ریاستی حکومتوں کی توجہ اس کوتاہی کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے تو عام طور پر جواب یہ ملتا ہے کہ ہمیں شکایات موصول ہی نہیں ہوتیں، واقعہ یہ ہے کہ ایک زمانے میں شکایتوں کا ایک دفتر تھا مگر چونکہ ان پر ریاستی حکومت نے کوئی توجہ نہیں کی اور لوگ بار بار توجہ دلا کر بھی سوائے تلخی کام و دہن کے کچھ اور نہ پا سکے تو وہ خاموش ہو کر بیٹھ گئے، ہم آج کی صحبت میں اردو دوستوں اور ریاستی حکومتوں کو اس سلسلے میں ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

کسی کوشش کی کامیابی یا ناکامیابی کا فیصلہ کس طرح کیا جاتا ہے۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس سلسلے میں ہر سال کے اعداد دئے جائیں اور پہلے کے مقابلے میں ترقی ظاہر ہو یا تنزل۔ سو یہاں حال یہ ہے کہ ریاستی حکومت اب تو لسانی اقلیتوں کے کمشنر کو ضروری اعداد و شمار بھی مہیا نہیں کرتی پچھلی رپورٹ میں اتر پردیش کے صرف سولہ ضلعوں کے اعداد و شمار تھے، باقی کے متعلق یہ کہا گیا تھا کہ ریاستی حکومت نے بھیجے ہی نہیں چنانچہ اس معروف طریقے سے یہاں کام نہیں لیا جا سکتا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے لئے انتظام تجویز ہوا ہے، وہ مطمئن ہوں۔ تو اطمینان کا کیا سوال ہے جب کہ اردو دوستوں کی گہری بے اطمینانی بلکہ مایوسی اظہر من الشمس ہے۔ تیسرا اور ہمارے نزدیک معروضی طریقہ یہ ہے کہ جس تناسب سے ریاست میں عام ابتدائی تعلیم کی ترقی ہو رہی ہے وہی تناسب، قدرتی طور پر لسانی اقلیتوں کے لئے ان کی مادری زبان کے ذریعہ سے تعلیم میں بھی ظاہر ہو۔ اس پر بھی لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی رپورٹ شاہد ہے کہ ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ اس لئے ہمارے

اشاعت کی تاریخیں
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

فی کاپی: ۱۵ پیسے
قیمت سالانہ: ۵ روپے

نزدیک ریاستی حکومت کی اس سلسلے میں کوشش کو صرف اس صورت میں کامیاب کہا جائے گا جبکہ وہ ازخود لسانی اقلیتوں کی خاص اور معقول آبادی کے علاقوں میں یا تو ابتدائی اردو تعلیم کے لئے اسکول کھولے۔ یا موجودہ اسکولوں میں اردو کے سیکشن کھولے۔ مثلاً اترپردیش کے ایسے شہر یا قصبے چالیس پچاس سے کم نہ ہوں گے جہاں اردو دوستوں کی آبادی پندرہ فی صدی سے کم نہیں ہے، ریاستی حکومت کو چاہئے کہ وہ سب سے پہلے ان تمام شہروں اور قصبوں میں جہاں اردو دوست پندرہ فی صدی یا اس سے زیادہ ہیں ازخود یا تو اردو میڈیم اسکول کھولے یا اردو کے سیکشن موجودہ اسکولوں میں کھولے۔ لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی یہ تجویز تھی کہ ہر جگہ پہلے سے ان طلبہ کے ناموں کا اندراج ہو جو جولائی میں داخل ہوں گے۔ اس اندراج کے لئے انڈر اسٹڈ رجسٹر رکھنے کا اصول حکومت نے بھی تسلیم کر لیا تھا۔ مگر یہ رجسٹر یا تو رکھے نہیں جاتے یا خالی رہتے ہیں۔ اس لئے اب سوائے اس کے کوئی اور صورت نہیں ہے کہ حکومت دفعہ ۳۵۰ الف کے سلسلے میں اپنی مفروضہ کوشش کو حقیقت بنانے کے لئے خود پہلے ہر ایسے شہر اور قصبے میں جہاں اردو دوست آبادی کے پندرہ فی صدی یا اس سے زیادہ ہیں، ابتدائی اسکول کھولے۔ مثلاً لکھنؤ شہر میں جہاں تقریباً ایک تہائی آبادی اردو داں اشخاص کی ہے، ایک تہائی اردو کے اسکول ہونے چاہئیں۔ اگر ان اسکولوں میں طالب علم نہ آئیں تو انھیں چند سال کے تجربے کے بعد بند کیا جا سکتا ہے۔ مگر شکایات پر توجہ نہ کرنا، اور خود بھی کوئی انتظام نہ کرنا، یہ ایسی کھلی ہوئی زیادتی ہے جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔

حکومت کو لسانی اقلیتوں کے لئے ان کی زبان میں ابتدائی تعلیم کا انتظام اس طرح کرنا چاہئے جس طرح عام اسکولوں کا کرتی ہے، جس طرح اپنے دوسرے فرائض انجام دیتی ہے۔ جمہوریت کے معنی یہی ہیں، حکومت کا دفتری نظام ایسا ہے کہ اوّل تو وہ شکایات پر توجہ نہیں کرتا، دوسرے خود بھی کچھ نہیں کرتا ان حالات میں یہ بہانہ کب تک کام دے گا کہ اس سلسلے میں شکایات موصول نہیں ہوئیں۔

اس طرح ہر ریاستی حکومت کو ثانوی تعلیم کے لئے بھی مناسب سہولتیں دینی چاہئیں، ہم یہ بات بار بار واضح کر چکے ہیں کہ اردو کے ذریعہ سے ثانوی تعلیم دینے کے معنی کسی صورت میں علاقائی زبان کو نظر انداز کرنے کے نہیں ہیں کیونکہ ان اسکولوں میں علاقائی زبان لازمی طور پر پڑھائی جائے گی اور اس کا معیار وہی ہوگا جو دوسرے اسکولوں میں ہے۔ اس طرح نہ تو حکومت کو یہ خطرہ ہونا چاہئے کہ علاقائی زبان پر توجہ کم ہوگی، نہ اقلیتوں کو یہ خوف ہونا چاہئے کہ ان کے روزگار کے معاملے میں دشواریاں پیدا ہوں گی، موجودہ قواعد کے تحت اگر کسی اسکول کی ایک تہائی تعداد مطالبہ کرے تو وہاں لسانی اقلیت کی زبان میں تعلیم کا انتظام ہو سکتا ہے۔ اترپردیش میں ایسا مطالبہ نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ تو ریاستی حکومت کا یہ رویہ ہے کہ وہ سوائے علاقائی زبان کے کسی دوسری زبان میں ثانوی تعلیم دینے کی روادار ہی نہیں مگر اس کے علاوہ لسانی اقلیتوں اور خصوصاً اردو دوستوں کے اندیشے بھی ہیں۔ ہمیں ان سے بلند ہو کر ثانوی تعلیم بھی اردو کے ذریعہ سے دینے کا مطالبہ کرنا چاہئے اور خود بھی ایسے اسکول کھولنے چاہئیں اور ان کے لئے دستور کی رو سے امداد بھی حاصل کرنا چاہئے۔

اردو زبان کی بقا اور ترقی کے لئے اور بھی بہت سے ضروری کام ہیں۔ مگر یہ وہ بنیادی ہیں، ان کی بھی پوری ضمانت تو اسی وقت ہوگی جب اردو کو دفعہ ۳۴۷ کے تحت بعض ریاستوں میں سرکاری طور پر تسلیم کر لیا جائے گا، مگر جب تک ایسا نہ ہو، ان بنیادی کاموں کے لئے حکومت اور عوام کو متوجہ کرتے رہنا تو بہر حال ہمارا فرض ہے۔

(صفحہ ۱ سے آگے)

اس طرح یہ کاروانِ زندگی چلتا رہا
ہم شکستہ پائی سے کرتے رہے منزل کی بات

اکثر ہنسی میں آنکھ سے آنسو نکل پڑے
غم بھی لگے ہوئے ہیں ہزاروں خوشی کے ساتھ

خود ہے آخری منزل جنوں کی
پریشان کیوں ہو میری آگہی سے

اس انتخاب کلام کی کتابت، طباعت اور کاغذ اوسط سے اوسط درجہ کا ہے۔ کتاب کا حجم اور مندرجات کو دیکھتے ہوئے قیمت کی بھی زیادتی کا احساس ہوتا ہے۔

محمد انصار اللہ

دیوان غالب کا متنازع نسخہ

دیوان غالب کے متنازع نسخہ بھوپال کے سلسلے میں میں نے جو کچھ عرض کیا ہے، اس سے میرا مقصد یہ، اس کے کچھ نہیں کہ اس نسخے سے متعلق حقیقت معلوم ہو جائے۔ اس کوشش میں میں نے ہر امکان پر جہاں تک ممکن ہوا ہے نظر کی ہے، کوئی قطعی بات کہنا ابھی میرے لئے مشکل ہے؛ دوسری طرف سے بھی ایسی باتیں سامنے نہیں لائی گئیں جو اس کوشش میں معاون ہوتیں، بہرحال میرے متعلق یہ خیال کرنا کہ میں قطعی طور پر اس نسخہ کو کسی ایسی سوچی سمجھی جعل سازی کا نتیجہ سمجھتا ہوں جو غالب صدی کے سلسلے میں عمل میں آئی صحیح نہیں ہے، یہ الفاظ میں نے کہیں بھی نہیں لکھے ہاں میرا خیال یہ ہے کہ یہ نسخہ بخط غالب نہیں ہے اس کی کتابت کس نے کی، کب کی اور کہاں پر کی اس بابت کوئی بات بھی کہنے سے میں فی الحال قاصر ہوں۔ میں نے اس نسخے سے متعلق اپنے خیالات کا جس طرح اظہار کیا ہے، اس کی داد پروفیسر گیان چند نے جن الفاظ میں دی ہے جی چاہتا ہے کہ اس سے زیادہ اور بہتر انداز سے اس نسخے کے بخط غالب ہونے پر اصرار کرنے والوں کی ہمت کی داد دی گئی ہوتی، یہ سچ ہے کہ میں نے اصل مخطوطہ نہیں دیکھا اور عکس میں مختلف النوع خامیاں ہو سکتی ہیں چنانچہ میں نے جو مثالیں دی ہیں ان میں بھی فروگذاشتیں ہو سکتی ہیں لیکن مسئلہ میری خامیاں اور غلطیاں گنانے سے حل نہیں ہوتا، حقائق پر غور و فکر کرنا ہوگا، اس طرف کما حقہٗ توجہ ابھی تک نہیں کی گئی ہے، عقیدت نے لفظوں کو "روشنائی کے دھبے" بنا دیا اور نقطوں کی صورتوں کو مسخ کر دیا ہے اور اصرار اس حد کو پہنچ گیا کہ کہا گیا ہے:

> "انصار اللہ صاحب کی مثالیں تلاش کر لینے کے باوجود مجھے اس پر اصرار ہے کہ غالب نے کبھی ط پر ط اور ڈ، ڑ پر چار نقطے نہیں بنائے ٹ پر ہمیشہ چار نقطے اور ڈ ڑ پر طا جاتی ہے، انصار اللہ صاحب کی مثالوں میں تو ایک نئی صورت سامنے ہے یعنی صرف دو نقطے ہیں جو غالب کے علاوہ بھی اردو میں ڈ ڑ پر نہیں بنائے گئے، تین صورتیں اردو میں رائج تھیں (ط) یا (۴) یا (∴) پیش کردہ مثالوں میں طباعت کے نقص نے ط کو (∴) یہ شکل دے دی ہے غالب نے ط ہی بنائی تھی انصار اللہ صاحب مطمئن نہ ہوں تو ان کے ماخذ ہی سے مثال دوں۔"

اس اصرار کے بعد میرا یہ کہنا مفید نہیں معلوم ہوتا کہ

(۱) گذشتہ مضمون میں اس طور پر زیر بحث صرف "ڈ" تھی "ٹ" "ڑ" نہیں۔

(۲) اردو میں ان حروف ثقیلہ کی صورتیں یہی تین تھیں یا ان کے سوا بھی کچھ اور، یہ مسئلہ زیر بحث نہیں اس لئے اس سلسلے میں صرف یہی کہنا چاہئے کہ اس مسئلہ سے اردو کے قدیم رسم تحریر کے جاننے والے بہتر طور پر واقف ہیں۔

(۳) جن خطوں کے حوالے سے میں نے یہ بات کہی تھی ان کے عکس پر تقوی چندر صاحب کے مرقع غالب میں نمبر ۴۹ اور نمبر ۴۲ پر شائع ہو چکے ہیں، ان میں یہی صورت ہے، دوسرے خط میں کچھ حصہ مٹا ہوا ضرور ہے، ہو سکتا ہے اس کے اصل میں وہی صورت ہو جو بیان کی گئی لیکن پہلے خط کی بابت اس کا امکان بظاہر نہیں ہے انھیں خطوط میں ڑ پر جو طا بنائی گئی ہے وہ زیادہ مختصر ہے اور دو نقطوں کی برابر جگہ اس کے مٹنے کے بعد باقی رہ جائے اس کا امکان کم ہے بہرحال میں نے جو دیکھا وہی لکھا اور مجھے اصرار نہیں کہ دوسرا بھی خواہی نخواہی اسے تسلیم کر ہی لے۔ البتہ میرے مضمون کا جواب لکھنے والوں کا حال سامنے ہے کہ وہ حقائق کو یا تو دیکھ نہ سکے یا انھوں نے ایسا چاہا نہیں، باوجود اس کے کہ میں نے اتنے قرائن پیش کئے کہ بعضوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ یہ طلسم پورے طور پر ٹوٹ چکا اور ایک نہایت محتاط عالم نے زیادہ احتیاط سے کام لیا تو یہ کہا کہ "میں اپنی رائے میں تذبذب اور تزلزل پاتا ہوں" اس کے باوجود بھی اصرار یہ ہے کہ:

> "ابھی تک انھوں نے صرف ایک قابل ذکر بات پیش کی ہے کہ اس مخطوطے کی غزل وم چند در باغ گلشن ہمیشہ بہار

واحد پریمی

غزل

غم کی اندھیری رات میں شمس و قمر چلو
تھوڑی سی زندگی ہے کوئی کام کر چلو

خوابوں کی وادیوں میں بہت سیر کر چکے
اب تو حقیقتوں کے سنہرے نگر چلو

ڈس لیں نہ زندگی کو کہیں خواہشوں کے ناگ
آسودگی کے شہر سے بچ کر گزر چلو

ہر چند شعلہ بار ہو سورج کا دیوتا
ہر چند ہو کڑی سے کڑی دوپہر چلو

گمراہیوں کے دشت سے بچنا ہے گر تمہیں
جس سمت راہبر نہ ہوں اس سمت پر چلو

ممکن نہیں کہ شمس و قمر ایک ساتھ ہوں
ہم اپنے راستے پہ، تم اپنی ڈگر چلو

تابندہ تر تمہارے نقوش سفر رہیں
واحد کچھ اس ادا سے سر رہگزر چلو

مولفہ نصراللہ خاں خویشگی میں میرامانی اسد کے نام سے درج ہے۔

میرا ارادہ تھا کہ مختلف دوستوں کی توجہ سے اس متنازع دیوان سے متعلق جو شکوک سامنے آئے ہیں ان کے متعلق تفصیل سے اظہار خیال کروں لیکن موجودہ صورت حال میں یہ بحث بے فائدہ معلوم ہوتی ہے، بہرحال اس سلسلے میں کچھ اور حقائق پیش کرتا ہوں چاہتا ہوں کہ اہل انصاف غور فرمائیں۔

اس نسخے کو بخط غالب تسلیم کرنے کی واحد بنیاد اس کا ناقص ترقیمہ ہے جس میں ۱۴ر رجب سہ شنبہ لکھا ہوا ہے سنہ ندارد ہے، اس کے کاتب نے غالب کی تحریر کے بعض مسلمہ اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے مثلاً فارسی الفاظ میں عربی کے حروف کا استعمال وغیرہ، اس خلاف ورزی کے لئے توجیہ اس طرح کی گئی کہ یہ غالب کے بچپن کا لکھا ہے اور مختلف قراین ایسے پیش کئے گئے جس سے اسے نسخہ حمیدیہ سے اقدم ثابت کیا جاسکے، پھر نعل خاں والی ۱۲۳۵ھ کی یادداشت کی کمک پر تقویم کی مدد سے ۱۲۳۱ھ کو اس کے سال کتابت کی حیثیت سے دریافت کیا گیا اور کہا گیا:

"ہم بہ اطمینان یہ کہہ سکتے ہیں کہ نسخہ مذکور میرزا صاحب نے منگل ۱۴ر رجب ۱۲۳۱ھ کو تمام کیا جو ۱۱ر جون ۱۸۱۶ء کے مطابق ہے۔"

(جناب عرشی رامپوری، آجکل جولائی ۱۹۶۹ء)

اس اطمینان میں یہ نکتہ بھی نظرانداز ہوگیا کہ ہجری تاریخوں کا انحصار رویت ہلال پر ہوتا ہے اور رویت کسی تقویم کی پابند نہیں ہے، ایک ہی شہر میں عید بعض لوگوں کے نزدیک ایک دن اور بعض کے نزدیک دوسرے دن ہوتی ہے پھر ڈیڑھ سو سال پہلے کی تاریخ کس طرح قابل اطمینان ہوسکتی ہے؟ اور اس قیاسی تاریخ پر پوری داستان کی بنیاد قائم کرلینا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے؟ تاحال کوئی ایسا کلیہ وضع نہیں کیا جاسکا ہے کہ اپنے زمانے کی بھی ہجری تاریخ رویت کے انحصار کے بغیر متعین کی جاسکے، ماضی بعید کی بات تو پھر دور کی ہے، احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس معاملے میں معاصر شہادتیں ضرور پیش نظر رکھی جائیں اس نقطہ نظر سے چند باتیں عرض کی جاتی ہیں:

۱۴ر رجب کو سہ شنبہ کا دن غالب کی زندگی میں سب سے پہلے ۱۲۲۱ھ میں واقع ہوا تھا جیسا کہ درج ذیل مادہ تاریخ سے ظاہر ہے۔

لیل جمعہ رجب بست و چارم حیف آہ : ۱۲۲۱

اس وقت مرزا کی عمر نو برس کے قریب تھی، ممکن ہے اس سے پہلے ایک سال اور اس تاریخ کو یہی دن واقع ہوا ہو لیکن ان دونوں سنوں میں اس دیوان کی کتابت متوقع نہیں ہے۔

۱۲۳۱ھ میں اگرچہ از روئے تقویم اس تاریخ کو وہ دن ہوگا لیکن معاصر شہادت اس کے برخلاف ہے چنانچہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے:

بود ماہ از شروع سال ششم — روز اثنین بود روز ۲۶
رشک تاریخ انتقال نوشت — بیست و پنجم ششم ای وا
۱۲۳۱ھ

یعنی ۲۵ر جمادی الثانی کو اس سال میں روز اثنین تھا، اس ماہ کے خاتمہ پر خواہ ۲۹ر کو خواہ ۳۰ر کو چاند نظر آیا ہو ۱۴ر رجب کو سہ شنبہ کا دن ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اہل تقویم کے حساب کی غلطی نے اس متنازع دیوان کے مویدوں کو غلطی میں ڈال دیا، یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ خود عرشی صاحب نے لکھا ہے:

"دیوان کی غزلوں کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اتنی کم عمری میں الخ"

(آجکل جولائی ۱۹۶۹ء)

اصولاً احتیاط کا تقاضا یہ بھی تھا کہ ایسے سنہ کو قبول نہ کیا جاتا جس پر خود اس سنہ کے متعین کرنے والے کو "حیرت" کے اظہار کی ضرورت پڑتی ہو، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جلال الدین صاحب (الٰہ آباد) نے اس سنہ میں چند قباحتیں ظاہر کی تھیں (نقوش اگست ۱۹۶۹ء) اور حال ہی میں لطیف احمد صاحب (ردولی) نے بھی اس کو خلاف قیاس قرار دیا تھا (ہماری زبان، ۱۵ر اکتوبر ۱۹۷۰ء) لیکن "اصرار" نے تمام قراین کو نظرانداز کرا دیا اس موقع پر یہ عرض کرنا بیجا نہیں کہ تحقیق ہو یا تنقید یا کوئی اور علمی معاملہ بنیادی بات یہ ہے کہ انصاف کو کسی حال میں بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا جانا چاہئے اور دوسروں کی باتوں پر بھی کبھی غور کرلینے میں فائدہ ہی کی صورت ہوتی ہے، دوسروں کے ساتھ تحقیر کا رویہ اختیار کرنا یا اپنی قیاس آرائی پر اصرار کرنا اکثر گمراہی کا سبب ہوتا ہے۔

بعض اہل تقویم کا خیال ہے کہ ہجری سنوں میں آٹھ سال کے بعد ایک تاریخ کو وہی دن واپس آتا ہے، اگرچہ یہ کلیہ نہیں ہے لیکن اس حساب سے ۱۲۳۱ھ کے بعد ۱۲۲۹ھ اور پھر ۱۲۲۷ھ میں ۱۴ر رجب کو سہ شنبہ کا دن ہونا چاہئے، حسن اتفاق کہ یہ تینوں سنہ از روئے تقویم ایک ہی دن شروع ہوتے ہیں۔ معاصر شہادتوں سے پتا چلتا ہے کہ ۱۲۳۰ھ میں ۱۴ر رجب کو سہ شنبہ کا دن نہ تھا، اس سے پہلے ممکن ہے کہ ۱۲۲۹ھ یا ۱۲۲۸ھ میں اس تاریخ کو یہ دن واقع ہوا ہو، قیاس چاہتا ہے کہ ان سنوں میں شاید اس متنازع دیوان کی کتابت نہ ہوئی ہو قطعی بات شاید "ماہرین غالبیات" کہہ سکیں۔

جلال الدین صاحب کا رویہ اس متنازع دیوان کے سال کتابت کے تعین میں زیادہ معقول اور غیر متشددانہ رہا ہے، ان کے نزدیک اس نسخے کی کتابت ۱۲۳۱ھ میں نہیں، ۱۲۳۶ھ میں ہوئی ہوگی، یہ سنہ بھی تقویم کی مدد سے معلوم کیا گیا ہے، اس کے لئے بھی معاصر شہادت تلاش کرنی چاہئے، میرے پیش نظر فی الوقت حضرت شیخ محمد مبارک حسین عرف شاہ دھومن کی تاریخ وفات ہے یعنی

"۶ر ربیع الاول ۱۲۳۶ھ بروز چہار شنبہ" (وسیلۂ شرف و ذریعۂ عزت مولفہ صوفی تلمیذ غالب مرتبہ ڈاکٹر طیب ابدالی ص۱۴۰)

مادۂ تاریخ "خورشید سلوک" بتایا ہے۔ اگر ربیع الاول سے رجب تک تین بار تیس تاریخ کو اور صرف ایک مرتبہ انتیس کو چاند نظر آیا ہو تو ۱۴ رجب کو پنجشنبہ کا دن ہوگا، اگر دونوں تاریخوں میں دو دو بار چاند دیکھا گیا ہو تو چارشنبہ ہوگا اور اگر ایک دفعہ تیس کو اور تین مرتبہ ۲۹ کو چاند نظر آیا ہو تو البتہ سہ شنبہ ہوگا لیکن یہ آخری صورت معقولاً قرین قیاس بہت کم ہے۔ اس بنا پر میرا خیال ہے کہ ۱۲۳۶ھ کو بھی اس دیوان کے ترقیمے کے دن اور تاریخ سے مطابق کہنا شاید صحیح نہیں ہے۔ تقویم کی مدد سے سنہ کتابت کی جستجو کرنے والوں نے تا حال ۱۲۳۱ھ اور ۱۲۳۶ھ کے مابین کسی بھی سال کے متعلق یہ خیال ظاہر نہیں کیا ہے کہ اس سال میں ۱۴ رجب کو سہ شنبہ کا دن رہا ہوگا اس لئے فی الحال میرے لئے بھی اس سے بحث کرنا ضروری نہیں معلوم ہوتا۔

۱۲۳۱ھ کو اس متنازع دیوان کا سال کتابت دو وجوہ سے مانا گیا تھا۔

۱۔ نسخہ بھوپال اول سے اس کی قدامت۔

۲۔ لعل خاں والی ۱۲۳۵ھ کی یادداشت۔

۱۲۳۶ھ کے لئے صرف اول الذکر ایک بنیاد باقی رہتی ہے اور یہ بھی اس لئے کہ غالباً سہواً ایک اہم نکتہ اس سلسلے میں نظر انداز ہو گیا ہے اس کی کیفیت یہ ہے۔ نسخہ بھوپال اول جس کی کتابت ۵ صفر ۱۲۳۷ھ کو مکمل ہوئی غالب نے نہیں لکھا ایک کاتب نے لکھا ہے، اگر یہ حقیقت ہو کہ یہ نسخہ غالب ہی کے لئے لکھا گیا ہو یا غالب نے اس پر نظر ثانی بھی کی ہو (یہ دونوں امور بھی قیاس محض میں اور ان کے لئے بھی کوئی قطعی ثبوت تا حال پیش نہیں کیا جا سکا ہے) تو بھی کاتب کے سامنے کوئی ایسا مسودہ ہونا چاہئے جس کی اس نے یہ نقل تیار کی ہے، اگر وہ مسودہ بخط غالب ہو تو اس بنیادی مسودہ کے زمانے کا قیاس کیا جانا چاہئے، فی الحال اس بابت کوئی فیصلہ کن بات کہنا میرے لئے ممکن نہیں بہر صورت اس متنازع دیوان کا مسودہ مذکور سے قدیم تر ہونا اگر ثابت کیا جا سکے تو یہ ایک نتیجہ خیز بات ہوگی، نسخہ بھوپال اول سے قدیم ہونا اتنی اہم بات نہیں ہے، میرا خیال ہے کہ اگر اس متنازع دیوان کی کتابت ۱۴ رجب ۱۲۳۶ھ کو ہوئی ہو تو بھی بہ لحاظ زمانہ یہ مسودہ مذکور سے قدیم تر نہ ہوگا۔ اس طرح یہ دوسری اور واحد بنیاد بھی اس سنہ کی تائید میں قائم نہیں رہتی، ایسی صورت میں ۱۲۳۶ھ کے بعد غالب کی زندگی میں جن جن برسوں میں ۱۴ رجب کو سہ شنبہ رہا ہوگا ہر ایک مساوی[۱] طور پر قابل لحاظ ہوگا۔

قاری شفیق الحسن صاحب نقلی سے منسوب یادداشت میں اس متنازع دیوان کو "مکتوبہ ۱۸۲۵ء" بتایا گیا ہے، قاری صاحب کو اس مسئلہ میں جیسا کہ تسلیم کیا گیا ہے کوئی "تعصب" نہ ہوگا ان کے تحریر کردہ اس سنہ پر بھی غور کرنا ضروری تھا لیکن اس نسخہ کے بخط غالب تسلیم کرنے والوں کو اپنے قیاس پر اس حد تک اصرار تھا کہ وہ اس سنہ کے امکان کی طرف توجہ بھی نہ کر سکے، مجھے یہ سنہ کھٹکتا رہا ہے چنانچہ میں نے اپنے مضمون میں اس طرف اشارہ بھی کیا تھا کہ شاید کوئی مفید مطلب بات سامنے آ سکے پروفیسر گیان چند صاحب نے اس بابت فرمایا ہے:

"شفیق الحسن نے اپنی ڈائری میں مخطوطے کو ۱۸۲۵ء کا مکتوبہ کیونکر لکھا اس کی تاویل سے فی الوقت میں معذور ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ مخطوطہ فروخت کرتے وقت شفیق الحسن کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ نسخہ ۱۸۲۵ء کا مکتوبہ ہے یہ بات بعد میں معلوم ہوئی ہوگی۔

صبا جائسی

غزل

اس طرح ملتے رہے خار مغیلاں مجھ سے
دو گھڑی مل نہ سکی سوزش پنہاں مجھ سے

اب بھی فکر عذاب دل و جاں ہے مجھ کو
کیسے مانوس ہوئی عمر گریزاں مجھ سے

میں نے لب سی لئے آنکھوں سے کہا کچھ نہ کہو
زندگی رہتی ہے کیوں پھر بھی پشیماں مجھ سے؟

جانے کیوں سوکھ گئی پھر بھی لفظوں کی زباں
جب سے آباد ہوا شور کا زنداں مجھ سے

دل بے کیف میں یادوں کی خلش تک بھی نہیں
کیوں الجھتی ہے صبا شورش طوفاں مجھ سے

۱؎ اس متنازع دیوان کے سلسلے میں جس طرح اصرار کیا جا رہا ہے اس کے پیش نظر شاید یہ بھی کہا جائے کہ نسخہ بھوپال اول کے کاتب نے ممکن ہے کہ سہواً ترقیمے میں ۱۲۴۲ھ کو ۱۲۳۷ھ لکھ دیا ہو، اگر ایسا ہوا تو پھر متنازع دیوان کو "اقدم" تسلیم کرنے کے باوجود اس کا زمانہ کتابت ۱۲۳۶ھ کے بعد ۱۲۴۲ھ تک کوئی بھی سال ہو سکتا ہے ممکن ہے کہ وہ ۱۲۴۲ھ ہی ہو۔

محترم نثار احمد فاروقی نے اس بابت ایک مفید اطلاع دی ہے اپنے مضمون "دیوان غالب بخط غالب" میں لکھتے ہیں:

"اس نسخہ دیوان کے ساتھ ایک مخطوطہ قصہ لیلیٰ مجنوں بھی جلد میں یکجا کر دیا گیا ہے جسے یکم ر ذیعم ۱۸۲۵ء مطابق ۲۰ ربیع الاول ۱۲۴۱ھ روز سہ شنبہ محمد امیر اللہ اکبر آبادی نے گوڑگانواں میں نقل کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ لیلیٰ مجنوں کسی نے بعد میں اس دیوان کے ساتھ ملحق کر دیا ہے، ممکن ہے یہ مرزا غالب کے پاس بھی رہا ہو۔"

(نذر مقبول مرتبہ خیر بہوردی)

مجھے معلوم نہیں کہ مذکورہ سنہ ان نسخوں کی مشترکہ جلد پر یا کسی اور جگہ پر لکھا ہوا تھا یا نہیں لیکن اس بنا پر کہ شفیق الحسن صاحب نے اس سنہ کی اس حد تک جستجو نہ کی ہوگی قیاس چاہتا ہے کہ یہ سنہ کہیں نہ کہیں لکھا ہوگا اور وہیں شفیق الحسن صاحب نے دیکھ کر اپنی یادداشت میں لکھ لیا ہوگا۔

محترم نثار احمد فاروقی نے جو کچھ لکھا ہے اس کی بنیاد پر خیال کیا جا سکتا ہے کہ دونوں مخطوطوں (متنازع دیوان غالب اور قصہ لیلیٰ مجنوں) کا کاغذ اور شاید روشنائی بھی ایک جیسی ہو اور ظاہرا دونوں نسخے ایک عمر کے بھی ہوں گے ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ دونوں نسخوں کے انداز خط میں کافی فرق ہے اس طرح یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دو مختلف کاتبوں نے ایک ہی سال میں ان دونوں نسخوں کو لکھا ہوگا اور یہ دونوں ایک مالک کی تحویل میں آنے کے بعد ایک جلد میں منسلک ہو گئے۔ ۱۲۴۱ھ اس لئے قرین قیاس ہے کہ ترقیمہ میں مذکورہ دن اور تاریخ پر خیال کرکے اگر حساب کریں اور یہ سمجھیں کہ ربیع الاول سے رجب تک دو مرتبہ ۲۹ر کو اور دو بار ۳۰ر کو چاند نظر آیا ہو تو ۱۴ر رجب کو سہ شنبہ کا دن ہوگا۔ یہ سنہ متنازع دیوان کے ترقیمے کے الفاظ سے مطابقت رکھتا ہے اس لئے کوئی بھی دوسرا سنہ قبول کرنے کے لئے مناسب یہ ہے کہ پہلے اس سنہ کو مسترد کرنے کے لئے مناسب ثبوت پیش کر دئے جائیں۔ اب تک اس پہلو پر بالکل غور نہیں کیا گیا ہے اس لئے متعلق حضرات اگر اس سلسلے میں معلومات فراہم کر دیں تو حقیقت بہتر طور پر سامنے آجانے کی توقع ہے عرشی صاحب نے لکھا ہے:

"دیوان کی غزلوں کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اتنی کم عمری میں خاصے مقامات پر شاعر کا تخیل کتنا گہرا اور طرز ادا کتنی دلاویز ہے۔"

۱۲۴۱ھ میں شاعر کی عمر اتنی ہوگی کہ اس کے گہرے تخیل اور اس کے دلاویز طرز ادا پر حیرت نہ ہو۔ یہ زمانہ وہ ہوگا جب غالب تحریک کے اصول وضوابط بھی متعین کر چکے ہوں گے اور ان سے توقع نہیں کہ انھوں نے اپنے اصولوں کی خود ہی خلاف ورزی کی ہو اس بنا پر بھی یہ نسخہ بخط غالب نہیں ٹھہرتا۔

▲

مراسلات

نسخۂ عرشی زادہ کے بارے میں

میں نے اپنے ایک گذشتہ مراسلے میں عرض کیا تھا کہ زیر بحث مخطوطہ دیوان میں غالب نے

تیرے سرو رعنا سے یک قد آدم

نہیں لکھا ہے اور خط کشیدہ مقام پر جناب نظر نے نون غلط پڑھا ہے۔ وجہ یہ بیان کی تھی کہ مخطوطے میں جگہ جگہ روشنائی کے دھبے ہیں یہاں بھی یہی صورت ہے اسی لئے غالب کو معتوب فرمانا درست نہیں۔ جن حضرات کو مخطوطات دیکھنے اور پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ قلمی کتابوں کی روشنائی ایسی ہوتی ہے جو برسات کے موسم کی ذرا سی بھی نمی میں متاثر ہو جاتی ہے اور کتاب پر معمول سے وزن ہے تو مقابل کے صفحات پر منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ بہت سی قلمی کتابیں ایسی بھی پائی گئی ہیں جن کے اوراق اسی صورت حال کی وجہ سے ایک دوسرے سے چپک کر رہ گئے اور جب انھیں ایک دوسرے سے جدا کیا گیا تو ایک دوسرے پر نشانات چھوڑ گئے۔ یہ دھبے کبھی کبھی اس بری طرح منتقل ہوتے ہیں کہ عبارت کا پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے کہیں معمولی طور پر یہ اثر پایا جاتا ہے جیسا کہ زیر بحث دیوان میں ہے۔

روشنائی کا ایک صفحے سے مقابل کے صفحے پر منتقل ہونا کتابت کے وقت بھی ہوتا ہے کہ ابھی روشنائی خشک نہیں ہوئی اور کتابت شدہ ورق پر آئندہ سادہ ورق رکھ دیا گیا ایسی صورت میں تازہ روشنائی کا (بالخصوص اس روشنائی کا جو مخطوطات میں استعمال ہوتی تھی اور جس میں گوند کی ملاوٹ بھی ہوتی تھی) دھبے دے جانا قدرتی بات تھی۔

بالکل یہی صورت زیر بحث نسخے میں بھی جگہ جگہ پائی جاتی ہے۔ چنانچہ متعدد مقامات پر روشنائی اس طرح منتقل ہوئی ہے کہ بآسانی ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف پڑھا جا سکتا ہے۔ چند مثالیں عرض کر دوں۔

وہ فسون دیدۂ مجلو شوخی افسانہ تھا
بال طاؤس سے ذیل پائی زنجیر آیا
شور جس کو بہار فرصت ہستی سے آگاہی سے چند آیا
آں را کہ ذیلے بہ بکسی بہانہ است
ندرت کشش نگار گاہ تحریر
بر چہرۂ نام خویش صادقے کردم

یہ نمونہ مشتے از خروارے ہے ورنہ اس قسم کی مثالیں بہت ہیں۔

کیا ان میں سے کوئی ایک مقام بھی ایسا ہے جسے غالب کے سر تھوپا جا سکے۔

ایک اور بات بھی عرض کر دوں جس غزل سے تبصرہ نگار نے مثال اخذ فرمائی ہے اسی غزل کے ایک شعر میں لفظ سویدا آیا ہے اور اس لفظ کے الف پر دو نقطے بھی ہیں میں جاننا چاہوں گا کہ اس نقطہ دار الف کو کیا تلفظ کیا جائے؟ خود تبصرہ نگار نے جو مصرع مثال میں پیش فرمایا ہے اس کے پہلے ہی لفظ کا پہلا حرف مشکوک ہے یعنی اس کی شکل بظاہر یہ ہے ثیرے (تیرے سرو رعنا سے ۔ ۔ ۔) یہاں ت کی جگہ ث کیا غالب کے حساب میں جائے گی۔ ہرگز نہیں۔ یہ ایک زائد نقطہ بھی روشنائی کا اسی قسم کا دھبہ ہے جیسا اس سے آگے آنے والے ایک لفظ کے ساتھ نظر آ رہا ہے پھر نظر صاحب کی مثال میں ن پڑھنے کے بجائے ت پڑھنا زیادہ مناسب ہوگا اس لئے کہ شکل کچھ یوں ہے رعنا تسے

نسخۂ عرشی زادہ کے حواشی کے لئے نوٹ تیار کرتے وقت غلط نقطہ لگانے کی مجھے صرف ایک مثال ملی تھی جس کا تذکرہ حواشی میں موجود ہے مگر بعد میں غور کرنے پر مجھے اپنا یہ ایک اعتراض بھی کم وزن معلوم ہوا۔ سوئے اتفاق سے اصل کی طرف رجوع کرنے کا موقع ہاتھ سے جا چکا تھا ورنہ کوئی حتمی بات کہہ سکتا وہ مثال تھی لفظ دداع جس کے آخری حرف پر نقطہ معلوم ہوتا تھا اور ع کے بجائے غ پڑھا جاتا تھا۔ بہت ممکن ہے یہاں بھی نقطہ نہ ہو روشنائی کا پُر فریب دھبا ہو۔

غرض زیر بحث دیوان کو پڑھتے وقت یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ اس میں ایک صفحے کی روشنائی نے دوسرے صفحے پر منتقل ہو کر بہت سے دھبے چھوڑے ہیں۔ اور املا کی اس غلطی میں جہاں نقطے کی کارفرمائی ہے نقطہ نہیں محض ایک دھبا ہے۔ قدرت کی اس ستم ظریفی پر غالب بیچارہ کیوں پکڑا جائے۔

امید ہے میاں ہدایت علی ہدایت اکبر آبادی شاگرد میاں محمد نظیر اکبر آبادی ہمعصر و ہم وطن غالب کا پتا ہمارے انصار اللہ صاحب نے لگا لیا ہوگا۔

رامپور   ○ اکبر علی خاں

تصحیح

قارئین ہماری زبان، نوٹ فرمالیں کہ ۱۵ر دسمبر کے ہماری زبان میں صفحہ ۵ پر جو مراسلہ بعنوان "غالب کی بھوپال والی غزل" شائع ہوا ہے اس کے مراسلہ نگار جناب نثار احمد فاروقی ہیں، سہو کتابت سے ان کا نام لکھنے سے رہ گیا تھا۔

(ادارہ)

انجمن کی خبریں

مردم شماری میں زبان کے خانہ میں اردو کا اندراج بہت ضروری

لکھنؤ: سلطانہ حیات صاحبہ انچارج کل ہند مردم شماری دفتر انجمن ترقی اردو (ہند) نے ایک بیان میں کہا ہے کہ ہر متمدن ملک کی منصوبہ بندی کا انحصار اس کی مردم شماری پر ہوتا ہے اس لئے ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ مردم شماری میں تعاون کرے تاکہ اندراجات صحیح ہوں۔ ساتھ ہی یہ اندازہ ہوجائے کہ اردو کتنے لوگوں کی مادری زبان ہے اور ملک میں ایسے لوگوں کی تعداد کتنی ہے جن کی مادری زبان اردو تو نہیں ہے۔ مگر وہ اردو سمجھ لیتے ہیں۔ اگر اس مردم شماری میں اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی صحیح تعداد کا اندراج ہوجاتا ہے تو ہمیں اردو کے حقوق کے لئے جدوجہد کرنے میں آسانی ہوگی۔ دراصل یہ مردم شماری اردو کی بقا کے مسئلے کو طے کرسکتی ہے بشرطیکہ اردو کے ہمدرد منظم کوشش کریں۔

مردم شماری سے متعلق پروگرام حسب ذیل ہے:

(الف) خانہ شماری مکمل ہوچکی ہے اور بعض مقامات پر ۳۱ر دسمبر ۱۹۷۰ء تک سرکاری طور پر خانہ شماری کا جائزہ لیا جائے گا تاکہ اگر کوئی نیا مکان بنا ہے یا کوئی شمار سے رہ گیا ہے تو وہ شمار کرلیا جائے۔

(ب) ۱۰ر فروری ۱۹۷۱ء سے طلوع آفتاب کے ساتھ اس خانہ شماری کی بنا پر مردم شماری کا کام شروع ہوکر ۲۸ر فروری ۱۹۷۱ء کو غروب آفتاب کے وقت ختم ہوجائے گا۔

(ج) ۲۸ر فروری اور یکم مارچ کو غروب آفتاب تک مردم شماری کا جائزہ لے کر کام مکمل کرلیا جائے گا۔ جائزہ لیتے وقت جو بچے اس عرصہ میں پیدا ہوتے ہیں ان کا بھی ایک الگ فارم بھر دیا جائے گا چنانچہ ان کی مادری زبان وہی لکھوانا چاہئے جو ماں کی زبان ہے (یعنی اردو)

(د) جو لوگ مرگئے ہیں ان کے شمار کے فارموں کو تلف کردیا جائے گا۔

لہٰذا مختلف حلقوں میں مردم شماری کے کام کو منظم کرنے کے لئے ایک مردم شماری کمیٹی بنائی جائے اس کام کو کیسے منظم کیا جائے؟ اور اس کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے کتابچہ "مردم شماری ۱۹۷۱ء اور اردو" دفتر کل ہند مردم شماری انجمن ترقی اردو ہند ۵ پہ ریور بنک کالونی لکھنؤ سے طلب کیا جائے۔

مردم شماری کمیٹی قائم کرنے کی اطلاع بھی دفتر مذکور کو دی جائے تاکہ مردم شماری سے متعلق سرکلر اور لٹریچر کمیٹی کو بھیجے جاسکیں۔

• راحت علی خاں جنرل سکریٹری ریاستی انجمن

رامپور میں بیگم سلطانہ حیات کی آمد

بیگم سلطانہ حیات، انچارج، کل ہند مردم شماری کمیٹی، انجمن ترقی اردو ہند رامپور کے دورے پر تشریف لائیں۔ بیگم صاحبہ مردم شماری کے مختلف پہلوؤں پر بڑی گہری نظر رکھتی ہیں چنانچہ انھوں نے جناب شبیر علی خاں شکیب، ایڈوکیٹ سے دو گھنٹے تک ان تمام پہلوؤں پر بہت تفصیل سے گفتگو کی۔ انھوں نے اور شکیب صاحب نے مادری زبان کے خانے میں اردو لکھوائے جانے کے لئے ضلع رامپور کے اہل اردو کو بیدار کرنے کے سلسلے میں ایک لائحہ عمل مرتب کیا۔

بیگم سلطانہ حیات کے مشورے سے عام تقسیم کے لئے جو پمفلٹ چھپوایا گیا تھا وہ بہت بڑے مجمعوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ شاخ رامپور کے ایک حالیہ اجلاس میں شکیب صاحب نے اعلان کیا کہ جنوری ۱۹۷۱ء کے آخری ہفتے میں وہ اور شاخ کے دوسرے عہدیدار ضلع رامپور کی تحصیلوں کا دورہ کریں گے اور انجمن کا پیغام گھر گھر پہنچائیں گے۔

• نامہ نگار

مردم شماری کے موقع پر زبان کے خانہ میں اردو کو اپنی مادری زبان لکھوایئے

۱۰ر فروری ۱۹۷۱ء سے شروع ہونے والی مردم شماری میں اردو جاننے والوں کی تعداد صحیح درج کرایئے تاکہ اردو کو حقوق مل سکیں مادری زبان کے لئے اس کا لکھنا پڑھنا جاننا ضروری نہیں ہے آپ کے بچے صرف ہندی ہی لکھنا پڑھنا جانتے ہیں تو بھی ان کی مادری زبان اردو ہی رہے گی۔ ہر خاندان کے ایک فرد کو (جس کو خاندان والے اپنا سربراہ کہدیں) یہ حق حاصل ہے کہ وہ مردم شماری سلپ یا فارم کی خانہ پری ہونے کے بعد یہ دیکھ لے کہ مادری زبان کے خانہ نمبر ۱۰ میں مادری زبان (پی ٹی) اردو درج ہے اگر سرکاری شمار کنندہ نے سب اندراجات صحیح کئے ہیں تو وہ اپنا اطمینان ظاہر کرنے کے لئے ہر فارم کی پشت پر اپنے دستخط کردے یہ حق ہم سرکاری مردم شماری آفس سے حاصل کرچکے ہیں۔ مردم شماری کے سلسلے میں مزید معلومات مقامی انجمن ترقی اردو کی سکریٹری محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ علی منزل کوچہ پنڈت دہلی سے اتوار کے سوا دس بجے سے ۱۲ بجے کے درمیان حاصل کیجئے اور جہاں انجمن کی شاخ نہ ہو وہ براہ راست بیگم سلطانہ حیات انچارج کل ہند مردم شماری کمیٹی انجمن ترقی اردو ہند ۵ پہ ریور بنک کالونی لکھنؤ سے معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔

مردم شماری کا ٹائم ٹیبل

۱۰ر فروری ۱۹۷۱ء سے ۲۸ر فروری تک گھروں کو شمار کیا جائے گا۔

۲۸ر فروری اور یکم مارچ کی درمیانی رات کو بے گھر لوگوں کو شمار کیا جائے گا۔ یکم مارچ کو طلوع آفتاب سے لے کر ۳ر مارچ کو غروب آفتاب تک مردم شماری کا جائزہ لیا جائے گا۔ (انجمن ترقی اردو دہلی)

ضلع بستی میں مردم شماری اردو کے لئے تحریک

بستی:۔ یہاں ضلع بستی مردم شماری کمیٹی کی تشکیل کی گئی اور ایک مخصوص نشست ڈومریا گنج میں ہوئی۔ جس میں محمد عدیل عباسی صاحب صدر انجمن ترقی اردو بستی اور قاضی محمد شکیل صاحب ایڈوکیٹ سکریٹری مردم شماری کمیٹی نے بستی سے جا کر شرکت کی، اس نشست میں یہ طے کیا گیا کہ ۲۷ر دسمبر کو تحصیل ڈومریا گنج اور تحصیل نوگڑھ کے ان کارکنان کی ایک مخصوص نشست ڈومریا گنج میں کی جائے جنھوں نے ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں کام کیا تھا اور کام کا نقشہ مرتب کیا جائے۔ اس کے لئے اشتہار چھپوایا جائے اور دعوت نامے جاری کئے جائیں بقیہ چار تحصیلوں کا جلسہ بستی میں شروع جنوری میں کیا جائے۔

مرکزی کمیٹی کو اس بات کی سخت توجہ دلائی گئی کہ اگر سربراہ خاندان ان پڑھ ہے تو کیا ہوگا؟ اور اگر مطالبہ کے باوجود مردم شماری کارکن مادری زبان اردو لکھنے سے انکار کرے یا نہ لکھے تو کیا کیا جائے؟ طے کیا گیا کہ مکانات پر نمبر لگوانے کے سلسلہ میں فوری کام جاری کر دیا جائے۔ • قومی آواز

انجمن ترقی اردو (پنجاب) کی جانب سے آل انڈیا مشاعرہ

چنڈی گڑھ:۔ انجمن ترقی اردو پنجاب کی جانب سے گورو نانک صاحب کی پانچسویں سالگرہ کے سلسلے میں ٹیگور تھیٹر چنڈی گڑھ میں ایک کل ہند مشاعرہ منعقد کیا گیا۔

مشاعرے کا وزیر اعلیٰ پنجاب سردار پرکاش سنگھ بادل نے افتتاح فرمایا اور صدارت کے فرائض وزیر تعلیم پنجاب سردار سرجیت سنگھ صاحب نے ادا کئے۔ وزیر مملکت برائے محکمہ تعلقات عامہ پنجاب نے گورو نانک صاحب کی زندگی اور تعلیم پر روشنی ڈالی۔ مشاعرے کی ابتدا نظیر اکبرآبادی کی نظم "گورو نانک شاہ" سے ہوئی۔ موضوعی کلام کے دور میں تقریباً بیس شعراء نے حصہ لیا اور غیر موضوعی کلام کے دور میں تقریباً اتنے ہی شعراء نے اپنے منتخب کلام سے حاضرین کو محظوظ فرمایا۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر صاحب نے مشاعرے کے دونوں دور اپنی روایتی شان سے چلائے حاضرین رات کے دو بجے تک شعراء کا کلام نہایت دلچسپی سے سنتے رہے۔ اس مشاعرے میں کل ہند شہرت کے بہت سے ممتاز اور نامور شعراء نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔

اس تقریب کے سلسلے میں ایک سووینیر بھی نہایت خوبصورت انداز سے آفسیٹ پر شائع کیا گیا تھا جس کی ترتیب اور حسن کا حسن اس تقریب کی روح رواں جناب سورج تنویر کے حسن سلیقہ کا نتیجہ تھا۔

تقریب سے پہلے ایک وفد کنور مہندر سنگھ بیدی سحر صاحب کی قیادت میں وزیر اعلیٰ پنجاب سے ملا اور انھیں اردو کے مسائل پر توجہ دلائی وزیر اعلیٰ صاحب نے نہایت ہمدردی سے وفد کی گذارشات سنیں اور ہر ایک مسئلہ کو حل کرنے کا وعدہ فرمایا۔ ملاقات کے بعد پنجاب میں اردو کے مستقبل کے بارے میں وفد نہایت پُرامید تھا۔ • الجمعیۃ

اردو دوستوں کے وفد کی وزیر اعلیٰ پنجاب سے ملاقات

چنڈی گڑھ:۔ انجمن ترقی اردو پنجاب کی طرف سے عیان اد کے ایک وفد نے وزیر اعلیٰ پنجاب سردار پرکاش بادل صاحب سے مل کر صوبے میں اردو کی ترویج کی جانب توجہ دلاتے ہوئے ان کی خدمت میں اپنے کچھ مطالبات پیش کئے۔ وزیر اعلیٰ صاحب نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ وفد کی گزارشات سن کر ضروری کارروائی اور مناسب اقدامات کرنے کا یقین دلایا۔

وفد نے وزیر اعلیٰ صاحب سے اپیل کی کہ پنجاب سرکار تحفظ اردو کے لئے مندرجہ ذیل تین فوری قدم اٹھائے۔ (۱) اردو کا سرکاری ماہنامہ جو بند کر دیا گیا ہے۔ دوبارہ جاری کیا جائے (۲) اردو کے شاعروں اور ادیبوں کی تصنیفات بھی ہندی پنجابی مصنفین کی طرح انعامات کے لئے قبول اور منتخب کی جائیں۔ (۳) اردو پڑھنے کے خواہش مند طلبہ کے لئے اسکولوں میں تعلیمی سہولیات مہیا کی جائیں۔ وزیر اعلیٰ صاحب نے یقین دلایا کہ یہ مطالبات جلدی پورے کر دئے جائیں گے۔ اس وفد میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، سورج تنویر، سردار اودے سنگھ شائق، شری شودیال سحاب، جناب مہر چند کوثر، سردار پورن سنگھ ہنر، شری رشی پٹیالوی، جناب ظفر ادیب، جناب ساحر ہوشیارپوری، اور دیگر محبان اردو شامل تھے۔ • نامہ نگار

اخبار و افکار

اردو کی تعلیم کی مناسب سہولتیں فراہم نہیں کی جارہی ہیں

نئی دہلی: یہاں کانگریس ورکنگ کمیٹی (حکمراں) نے اسباب پر اپنی مایوسی کا اظہار کیا ہے کہ متعدد ریاستوں نے اردو بولنے والے عوام کو ان کی مادری زبان میں تعلیم کی سہولتیں مہیا نہیں کی ہیں۔

ورکنگ کمیٹی نے اپنے اس خیال کا اظہار بھی کیا ہے کہ وقتاً فوقتاً اس سلسلہ میں قطعی فیصلے کئے جاتے رہے ہیں لیکن ان پر عمل درآمد کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔

ورکنگ کمیٹی نے کل اپنے جلسہ میں اقلیتوں کے مسائل پر غور کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ لسانی اقلیتوں کو ان کی مادری زبان کے ذریعہ تعلیم کی جو دستوری سہولتیں حاصل ہیں ان کو پورا کیا جائے اور اس کے لئے اقدامات کئے جائیں۔　　• قومی آواز

اردو کی ترویج کی تجویز کی حمایت

مئوناتھ بھنجن (اعظم گڑھ) بھارتیہ کرانتی دل کے رہنما اور اترپردیش کے نائب وزیر محنت و آبکاری مولانا حبیب الرحمن صاحب نعمانی نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ میری پارٹی اردو کی ترقی و ترویج اور اس کی ارتقاء و بقا نیز اس کے جملہ دیگر حقوق کی حفاظت کے حق میں ہے لیکن اس کو دوسری زبان کا درجہ دینے کا مسئلہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔

انھوں نے ایک دوسرے سوال کے جواب میں کہا کہ میں اردو کو دیوناگری رسم خط میں تبدیل کئے جانے کے خلاف ہوں۔

• سیاست

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے اعزاز میں ایک ادبی نشست

حلقۂ ارباب ذوق، گورکھپور کے زیر اہتمام ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے اعزاز میں زیر صدارت جناب ڈاکٹر محمود الٰہی صدر شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی ایک ادبی نشست منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر احمر لاری نے مہمان خصوصی کا تعارف کراتے ہوئے ان کے تخلیقی اور تنقیدی کارناموں پر روشنی ڈالی۔

افغان اللہ جالب نعمانی، رضوان اللہ، مرغوب حسن، اشفاق احمد اعظمی، غلام رسول مکرانی، ڈاکٹر احمر لاری، ڈاکٹر سلام سندیلوی، انور گورکھپوری اور ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے بالترتیب اپنا کلام سنایا۔

آخر میں ڈاکٹر اعظمی نے جدید شعری رجحانات کا جائزہ لیتے ہوئے گورکھپور کے نوجوان جدید شعرا کو چند مفید مشورے دئیے۔ صدر کے کلام پر نشست کا اختتام ہوا۔　　• اختلاف

گجرات کی سرکار کی اردو دشمنی

گجرات سرکار نے بھی ملک کی کئی اردو دشمن صوبائی حکومتوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اردو کو ختم کرنے اور اس کی تعلیم میں رکاوٹیں ڈالنے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے آزمانے شروع کر دیئے ہیں۔ اردو ٹیچروں کے لئے ٹریننگ جدوجہد کے بعد ایک ٹریننگ کلاس شروع کی گئی تھی اور اس میں اردو تعلیم کے لئے ٹیچر رکھے گئے تھے لیکن اب ان کا پوسٹ ختم کر دیا گیا اور اس ٹریننگ کلاس کو بالکل ناکارہ کر دیا گیا ہے۔ اس اقدام کے علاوہ سب سے زیادہ قابل افسوس رویہ نصابی کتابوں کے بارے میں اختیار کیا ہے۔ نصابی کتابوں کو منظور اور تیار کرنے کا کام جو بورڈ بنایا ہے وہ اردو کے خلاف کھلی جانبداری برت رہا ہے۔ اس بورڈ نے ۸۱-۱۹۸۰ء کے لئے اردو کی پانچویں جماعت منظورہ تاریخ اور جغرافیہ جیسے اہم مضامین کی نصابی کتابیں تعلیمی سال کے چھ ماہ گزر جانے کے باوجود اب تک طبع کرانے کا انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ اور اس طرح تاریخ اور جغرافیہ جیسے اہم مضامین کے بغیر ہی ایک میقات پوری ہو گئی ہے اور دوسری میقات بھی ختم ہو جائے گی۔ ایسی صورت میں طالب علموں کو کس قدر نقصان ہوگا اس کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

نصابی کتابوں کی طباعت اور فروختگی کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد گجرات سرکار کے محکمۂ تعلیم نے بے ڈھنگے پن سے اسکول کی نصابی کتابیں تیار کرنے اور اسے چھاپنے کا کام کیا ہے۔

ہفتہ وار حیات نئی دہلی

گورکھپور یونیورسٹی میں ایک ادبی نشست

گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ڈاکٹر مسیح الزماں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے اعزاز میں ایک ادبی نشست منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر محمود الٰہی صدر شعبۂ اردو نے معزز مہمان کا تعارف کراتے ہوئے ان کے تخلیقی اور تنقیدی اکتسابات پر روشنی ڈالی۔

شعیب ندیم، انوار افضل، موسیٰ قمر درج، اشفاق احمد اعظمی، انجم عرفانی، غلام رسول مکرانی، ڈاکٹر احمر لاری اور ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اپنے اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ آخر میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے کئی نظمیں اور غزلیں سنائیں۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور ڈاکٹر مسیح نے اپنی صدارتی تقریر میں گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی رفتار ترقی کو سراہا۔　　• احمر لاری

تبصرے

آئینہ ... توں کا

ض... رنگ

سیف بجنوری

...ڈ بک ایجنسی مدینہ منزل، بجنور

• ۳۰ روپے

زیر تبصرہ کتاب شعرائے بجنور کے انتخاب کلام پر مشتمل ہے
...میں وقار بجنوری، سردار جلیل شیرکوٹی، اعجاز وارثی سیف
...، تاباں بچھرایونی، شمس آبادی، اقبال عابدی اور
...دی کا کلام پیش کیا گیا ہے۔ سیف بجنوری صاحب
... جگہ اس لئے قابل توجہ ہے کہ انھوں نے
... میں پڑے ہوئے ان چند شعراء کو ادبی دنیا
... کرانے کی کوشش کی ہے جو نامساعد حالات
...ب ماحول کی وجہ سے وہ کام نہ انجام دے
...نجام دینے کی وہ صلاحیت رکھتے تھے۔ اس طرح
...کی اشاعت سے ادبی دنیا تک یہ بات وقتاً فوقتاً
...ہے کہ ہنرمندی اور فن کاری کے لئے جس مناسب
... ذہنی فضا اور جس پذیرائی کی ضرورت ہے اس
...احول اب بھی کتنا بے خبر اور بیگانہ ہے۔ مندرجہ
...ر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر مذکورہ
...و مناسب پذیرائی اور تہذیب فکر کا موقع ملتا
...ر شاعری کے تسلسل کو بڑی حد تک برقرار رکھتے
...کے دامن میں مزید وسعت پیدا کرنے کی اہلیت
...تی۔

لے سبق ضبط لوگوں کو کیا دو ل ثبوت غم
ڈرے ہنسی کے میں نے تو آنسو بھی پی لئے
تابش حسن یاد نے چھین لی تاب ہوش شوق
جتنے قریب آئے وہ اتنے ہی فاصلے بڑھے
وہ تو یہ کہئے کہ مجبور ہے نظم ہستی
ورنہ ہر بندہ مغرور خدا ہو جاتا
جبیں سائل تھی نادم ہے گرائے سجدہ آخر
مری محرومیوں سے بے تعلق آستاں کیوں ہو
سناؤں تم کو دو لفظوں میں حال خوبی قسمت
مرے دامن پہ برسے بھی تو اشکوں کے گہر برسے
سنو تو کہتے ہو کسی کا درد کیا جانے کوئی
...ئی گویا تمہارے منھ پہ میرے دل کی بات
...تضاد میں مضمر ہے زندگی کا فسوں
چراغ بجھے اور کہیں چراغ جلے

(باقی صفحہ کالم ۲ پر)

صفحہ ۲ سے آگے

افسوس ہے کہ گپت جی جیسے استاد اب کم ہوتے جا رہے ہیں۔ میں کبھی گپت جی اور بھوانی شنکر کو نہیں بھول سکتا۔ دونوں سے تھوڑے ہی دن پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ مگر دونوں نے انگریزی ادب کے مطالعے کا شوق پیدا کر دیا۔ دونوں امرناتھ جھا کے چہیتے شاگرد تھے۔ دونوں اپنے شاگردوں سے ایسی محبت کرتے تھے جیسے باغباں اپنے پھولوں سے یا ماں باپ اپنی اولاد سے کرتے ہیں۔ بھوانی شنکر کا عرصہ ہوا انتقال ہو چکا تھا گپت جی بھی چل بسے مگر ان کے ہزاروں شاگردوں کی طرح میرے دل میں بھی ان کی یاد بسی رہے گی، ان کی دلنواز شخصیت، ان کا دلوں کو جگمگانے والا اور روحوں کے تار چھیڑنے والا تبسم ان کی فراغ دلی، ان کی وسیع المشربی ان کی وضعداری، ان کی وہ علمیت جو مرعوب کرنے کے لئے نہیں روشنی دکھانے کے لئے تھی، ان کی وہ بڑائی جو اپنے سے چھوٹوں کو بڑا کہہ کر اپنی عظمت کا نقش اور گہرا کر دیتی تھی۔ ان کے مزاج کی نرمی اور طبیعت کا گداز۔ اس دولت کو ان کے دوست اور شاگرد اب کہاں پائیں گے اور اس سے محرومی پر کیونکر صبر کریں گے۔

▲

آل احمد سرور

میرا صفحہ

دس نومبر کو الہ آباد میں پرکاش چندر گپت کا انتقال ہوگیا۔ کون پرکاش چندر گپت، امرناتھ جھا کے محبوب شاگرد، الہ آباد یونی ورسٹی میں انگریزی کے ریڈر اور آخر میں صدر شعبہ ہندی کے ممتاز ادیب، ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن، کمیونسٹ پارٹی کے ممبر، میرے سینٹ جانس کالج کے استاد۔

میں ۱۹۳۱ء میں سینٹ جانس کالج میں تھرڈ ایر سائنس میں تھا۔ جنرل انگلش پڑھانے کے لئے سال کے دوران میں ایک نوعمر استاد آئے۔ نئے استاد کو طالب علم شروع میں پریشان کرتے ہیں، مگر ان صاحب میں نہ جانے کیسی موہنی تھی اور طلبہ کے اُلٹے سیدھے سوالات کا اس خندہ پیشانی سے جواب دیتے تھے کہ وہ ایک دن کے بعد ہی کلاس میں ضبط و نظم قائم ہوگیا۔ انھوں نے ہم لوگوں کو تھرڈ ایر میں چند مہینے ہی پڑھایا۔ پھر کوئی دوسرے صاحب آگئے، مگر یہ ہمارے بشپ فرینچ ہوسٹل کے اسسٹنٹ وارڈن بھی ہوگئے تھے، اس لئے ان کو قریب سے دیکھنے اور ان سے ملنے کے برابر موقعے ملتے رہے۔ بشپ فرینچ میں عام طور پر ہندو طلبہ زیادہ ہوتے تھے، مگر ہوسٹل کے عہدے ایک روایت کے مطابق برابر برابر تقسیم ہوجاتے تھے۔ اس سال مسلمان طلبہ زیادہ تھے، انھوں نے کچھ خاص عہدے اپنے لئے رکھنے چاہے وارڈن نے روایت کو ٹوٹتے دیکھا تو تمام طلبہ کو کامن روم میں جمع کیا اور کہا کہ تم لوگوں کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہو عہدوں کی تقسیم کرو، مگر جو طریقہ چلا آرہا ہے اس کی پابندی کرنے سے آئندہ دشواریاں پیدا نہ ہوں گی۔ گپت جی بھی موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ جب مسلمان طلبہ کی اکثریت ہے تو انھیں اختیار ہے کہ جس طرح چاہیں عہدے تقسیم کریں، میں نے اور دوسرے طلبہ نے گپت جی کی فراخ دلی دیکھ کر اسی روایت کی پابندی پر زور دیا جو چلی آرہی تھی، بعد میں سب اس پر راضی ہوگئے۔ اب بھی یاد ہے کہ اگر گپت جی اس طرح اکثریت کے حقوق کو تسلیم نہ کرتے تو میں اپنے ساتھیوں کو اس پر راضی نہ کرسکتا کہ پرانے طریقے پر کاربند رہیں۔

گپت جی چند سال کے بعد الہ آباد چلے گئے، ان سے الہ آباد میں، دہلی میں، علی گڑھ میں ملاقات ہوتی رہی مجھے یاد ہے کہ انھوں نے نور تھا ایر میں ہوسٹل کی طرف سے ایک قلمی میگزین نکالا تھا اس میں گپت جی نے میری بڑی مدد کی تھی اور پر ایک مضمون لکھ کر دیا تھا۔ جب کبھی میں الہ آباد جاتا تو اعجاز صاحب کے یہاں قیام ہوتا اور ان جمعراتی کلب میں تقریریں بھی ہوتیں۔ ایسے موقع پر گپت جی آتے تھے، بڑی محبت سے ملتے تھے، میں بڑے فخر سے دوسروں کو بتاتا تھا کہ گپت جی نے مجھے سینٹ جانس کالج میں پڑھایا ہے، الہ آباد میں وہ لوگ بھی جو ادبی معاملات میں ان سے اختلاف رکھتے تھے، گپت جی کی سنجیدگی، ان کی علمیت ان کی وضع داری، ان کی محبت کے قائل تھے۔ گپت جی اپنے شاگردوں سے کتنی محبت کرتے تھے اس کا اندازہ مجھے پچھلے اگست کے لینن سیمینار میں ہوا، جو ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے دہلی میں ہوا تھا۔ اس سیمینار میں امرت رائے، گپت جی نے ہندی ادب میں لینن کے اثرات گپت جی نے لینن کے اثر کو میرے نزدیک زیادہ اہمیت دی تھی۔ وقت کے ساتھ گپت جی کے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، میں نے پڑھا اس میں لینن کے انقلابی رول کو تسلیم اس کے ادبی نقطۂ نظر کو محدود قرار دیا تھا کیونکہ وہ ادب کو ایک خاص سیاسی اور سماجی نقطۂ نظر کا آلۂ کار بنانا چاہتا تھا۔ میرے مقالے پر سجاد ظہیر نے خاصی برہمی ظاہر کی۔ ان سے یہی توقع تھی۔ مگر گپت جی نے کہا کہ میرے مقالے میں ایک پہلو تھا، سرور صاحب کے مقالے میں دوسرا پہلو ہے۔ ظاہر ہے انھیں میرے نقطۂ نظر سے اختلاف تھا مگر اختلاف میں برہمی نہ تھی ایک دانشور کا ضبط و نظم، ایک ادیب کا وقار تھا۔

ہندی ادب میں، ہندی افسانے میں گپت جی کی کیا اہمیت ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کا میں اہل نہیں ہوں، میں تو صرف یہی عرض کروں گا کہ ان کے جو مضامین میں نے انگریزی میں پڑھے ان میں خلوص اور نظر دونوں کی کارفرمائی ہے۔ انھوں نے بڑی پاکیزہ زندگی گزاری۔ نہ سیاسی میدان میں کرتب دکھائے نہ یونی ورسٹی کی بساط پر داؤ پیچ۔ پڑھنے پڑھانے میں مگن رہے۔ طلبہ سے شفقت اور محبت سے پیش آتے رہے۔ کئی سال ہوئے دل کا دورہ پڑا تھا۔ پھر ٹھیک ہو گئے اور اپنے تعلیمی فرائض کی انجام دہی میں لگ گئے۔

(باقی صفحہ ۱۱)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) سے
REGD-NO-L-922 فون نمبر ۲۹ R-NO-2166/57